مذہبی، سماجی اور ثقافتی بیانیے: تشکیلیت، ردِ تشکیلیت اور تارڑ کا ناول "قلعہ جنگی" (ایک مابعد جدید مطالعہ)

"Religious, Social and Cultural Narratives"Construction, Deconstruction and Tarar's Novel Qala-i-Jangi (A Post Modern Study)

محمد یوسف نون

(پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان)

پروفیسر ڈاکٹر قاضی عابد

(استاد شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان)

Abstract:

"Today, man lives in narratives.Therefore, effects of narratives can not be denied.Many narratives are formed and refuted overtime. Postmodernism too rejects the meganarratives and on other hand promotes local narratives. Every truth and ideology that claims universality and absolutism is mega narrative. Tarar's novel "Qala-i-Jangi" is set against the backdrop of Afghan Jihad (war). In this novel process of construction and deconstruction of many mega narratives i.e.social, cultural narrative and especially the religious jihadinarrative have been fictionized. The characters in the novel which are part of the Afghan war are tied to the mega narrative of Jihad. After being pushed into this war when they have a chance to take a closer look at the situation, many facts are revealed before them. As a result theses mega narratives are refuted. This research article explores and presents the process of construction and deconstruction of the mega narratives.

Key words: Narrative, Jihad, construction, deconstruction, postmodernism, religious

کلیدی الفاظ: بیانیہ، جہاد، تشکیل، ردِ تشکیل، مابعد جدیدیت، مذہبی

بیانیہ (Narrative) کی اصطلاح کو سب سے پہلے رولاں بارتھ نے متعارف کرایا، انہوں نے اپنے ایک مضمون Introduction to the Structural Analysis میں ان بیانیوں کو نشان زد کیا جن پر ہماری ثقافت کا انحصار ہے۔ رولاں بارتھ بیانیوں کی بے شمار قسمیں بتاتا ہے۔ وہ کھڑکیوں اور رنگ دار شیشوں کو بھی ایک بیانیہ شمار کرتا ہے، جو اس دنیا کو بامعنی بناتے ہیں۔(1) لیوتار مابعد جدیدیت کے بنیاد گزاروں میں سے ہے۔

وہ مہابیانیوں (Grand Narrative) اور چھوٹے بیانیوں (Little Narratives) میں تمیز کرتا ہے۔ لیوتار علم کی دو قسمیں بتاتا ہے ایک سائنس دوسرا بیانیہ ہے۔ لیوتار سائنس اور بیانیہ کو دو حریفوں کی شکل میں دیکھتا ہے۔ لیوتار سائنس اور ٹیکنالوجی کی بھیڑ کے درمیان بیانیہ کا وجود لازم قرار دیتا ہے۔ سائنس کو اپنی صداقت ثابت کرنے کے لیے ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے اور بیانیہ اس سے مبرا ہوتا ہے۔ سائنسی روایت اپنی صداقت ظاہر کرنے کے لیے بیانیہ کا سہارا لیتی ہے۔ اب سائنس بھی ایک بیانیہ کا روپ دھار چکا ہے۔[۲] سائنس اپنی معروضیت اور دیانت داری کو پیچھے چھوڑ کر طاقت ور کا آلہ کار بن چکا ہے۔ مہابیانیہ آخر ہے کیا؟ مہابیانیہ ہر وہ آفاقی تھیوری ہے جو خود کو کائناتی سچ قرار دیے جانے پر مصر ہے۔ مہابیانیے کائناتی سطح پر خود کو مستند تصور کرتے ہوئے کائنات کے نظام کی تشریح اور اس میں اپنے کلیدی کردار ادا کرنے کے دعویدار ہوتے ہیں۔ اس طرح مابعد جدیدیت مہابیانیوں کے بارے میں بے یقینی اور بے اعتمادی کے موقف کا علامیہ بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ مہابیانیے مذہبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی پہلوئوں کے ساتھ ساتھ کسی بھی شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ مابعد جدیدیت ان تشکیلی بیانیوں کی رد تشکیل (Deconstruction) یا تکثیریت (Pluaralism) کی قائل ہے۔

مابعد جدیدیت ایک ایسا طرزِ فکر و نظر ہے جس نے جدید عہد کے ہر نظریے کو مسترد کرتے ہوئے اس پر تشکیک سے سوالات قائم کرنے کا خاصا مضبوط جواز فراہم کیا ہے۔ کئی مذہبی، سماجی، سیاسی، استعماری، مذہبی، سائنسی اور دیگر موضوعیت کے ایسے نظریات ہیں جنھیں گزرتے وقت کے ساتھ منہ کی کھانی پڑی ہے۔ ایسے مہابیانیوں کی ناکامی اور شکست و ریخت سے مابعد جدید فکر کو بطور خاص تقویت ملتی ہے۔ تصور کامل، آفاقی سچ، مکمل ضابطۂ حیات، بہبود و ترقی، عدل و انصاف، امن و محبت، رواداری، ہمہ گیریت اور بھائی چارہ سے متعلقہ کئی مہابیانیے بے نقاب ہو کر اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی مہابیانیے سے متعلق لیوتار کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ”مہابیانیہ سے مراد وہ مفروضہ سچائی ہے جس کو کوئی بھی تہذیبی اکائی ناقابل تردید اور آفاقی حقیقت ناقابلِ تردید عقیدے کا درجہ دے دیتی ہے اور پھر اس پر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اپنے اس عقیدے کو جب بھی خطرے میں دیکھتی ہے تو جنگ و جدال پر اتر آتی ہے۔ تمام توسیع پسند اپنے اپنے عقائد کو حتمی جان کر دنیا بھر میں اقتدار کے پرچم لہرانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اس قسم کی مفروضہ سچائیاں بالعموم تہذیبوں کو معروضی جواز فراہم کرتی ہیں۔“[۳]

تارڑ کا ناول ”قلعہ جنگی“ اوراس کے سات مرکزی کردار ایسی کسی مفروضہ سچائی یا تصور کامل کے متلاشی ہیں یا پھر وہ اپنے اس تصور کامل کو درپیش خطرے سے پیش نظر اسے بچانے نکلے ہیں، مگر آخر میں اسی مہابیانیے کی ردِ تشکیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تارڑ کا یہ ناول افغان جنگ کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ وہ جنگ ہے جو اسلام کے نام پر غیر اسلامی طاقتوں کے ایما پر لڑی گئی۔ یہ جنگ جو دراصل دو بڑی طاقتوں یعنی دو مہابیانیوں روس اور امریکہ کی تھی۔ امریکہ اوراس کے حلیفوں سعودیہ اور پاکستان نے اس جنگ کو مذہبی مہابیانیے کا لبادہ اوڑھوا کر اسے جہاد افغان کے نام سے موسوم کیا، اس جنگ میں بطور اینڈھن کام آنے والی افرادی قوت مجاہدین اسلام یا طالبان کے نام سے جانی پہچانی گئی۔

اسلام ایک توسیع پسند اور عالم گیر مذہب ہے۔ جہاں تک توسیع پسندانہ عزائم کا تعلق ہے اس کے لیے دو راستے اہمیت کے حامل ہیں، ایک تبلیغ اور دوسرا جنگ و جدل کا ہے۔ دین کی حفاظت، سربلندی اور توسیع پسندی سے کون کافر انکاری ہو سکتا ہے۔ جنگ و جہاد کی ایسی مثالوں کا ذکر کیے بغیر ہماری مذہبی تاریخ نامکمل ہو گی۔ ہمارے بنیادی مذہبی نصاب میں سے جہاد کی فرضیت و فضیلت اور اہمیت وضرورت واضح ہے۔ تاریخ اس امر میں گواہ ہے کہ اس جہادی بیانیہ کو بے جا اور غلط استعمال بھی کیا گیا، اس بیانیے کو استعماری قوتوں کی طرف سے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے دست نگر بنانے کی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ معاصر مثال جہاد افغان کی ہے۔ یہ بات اب روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ امریکہ نے اپنے حریف سوویت یونین کو توڑنے اور افغانستان میں سوویت فوج کو دھول چٹانے کے لیے جہادی مہابیانیہ کو آلہ کار بنایا۔ اس مقصد کے لیے تمام سماجی حلقوں کو اس جعلی جہادی بیانیہ کی جکڑ بندیوں میں لانے کی کوشش کی گئی، تعلیمی اداروں بالخصوص دینی مدارس نے اس جنگ کے لیے پنیری فراہم کر کے اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق افغان جہادی بیانیہ کے آغاز اور مقاصد سے اس طور پردہ چاک کرتے ہیں:۔

> ”۱۹۷۰ء کے عشرے میں پاکستان میں محض چند سو مدارس تھے لیکن اسلام کو بطور جہادی نظریہ سیاسی رنگ دینے کے بعد ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط تک یہ تعداد ۱۲ ہزار سے ۱۵ ہزار تک پھیل گئی۔ بالخصوص پاک افغان سرحد کے ساتھ۔۔۔ ایک اندازہ ہے کہ ۱۵ لاکھ سے ۲۰ لاکھ طالبان انہی مدارس کی پیداوار تھے۔ اس سلسلے میں جہادی نظریے کے فروغ کے لیے امریکہ کا کردار قابلِ توجہ ہے۔ مسٹر جو سٹیفن اور ڈبلیو ڈی بی اوٹاوے نے ”امریکہ کی طرف سے جہاد کی اے بی سی“ کے عنوان سے ایک آرٹیکل میں لکھا ہے کہ یو ایس ایڈ کی ۵ کروڑ ڈالر مالیت سے یونیورسٹی آف نبراسکا اوماہا کے سنٹر آف افغانستان سٹڈیز نے سکولوں کا جو درسی نصاب شائع کیا اس کا مطمع نظر مجاہدین میں جہاد کے نظریے کو فروغ دینا تھا۔“[۴]

امریکہ نے لاکھوں ڈالر کی سرمایہ کاری سے جو مجاہد سازی کی صنعت کاری کی، اس سے اپنی ضرورت کی کارآمد پراڈکٹس کی تیاری کے لیے ایسی نظریہ ساز کتب کی تیاری کی گئی جو پر تشدد تصاویر اور عسکریت پسندانہ تعلیمات سے مزین تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر کتب پاکستان میں چھاپی گئیں۔ یہ سوا کروڑ سے بھی زائد کتب تھیں جو افغان مہاجر کیمپوں اور پاکستانی مدارس میں پڑھائی جاتی رہیں۔[۵] ان کتب کی تیاری میں اسلامی جہادی تعلیمات سے خاطر خواہ استفادہ کے بعد ایسا نصاب مرتب کیا گیا تھا جس سے ایک لمبے عرصہ تک افغانستان میں نظریاتی جنگ جاری رکھی جا سکتی تھی۔ کسی مہابیانیے کا اپنی اصل روح سے کٹ کر استعماری قوتوں کے ہاتھوں یرغمال بننا ہی دراصل اس کی اپنی ردِ تشکیل کی طرف پہلا قدم ثابت ہوتا ہے۔

کسی مہابیانیے سے ٹکرانا ہر گز کوئی عام اور آسان کام نہیں ہے۔ کسی تخلیق کار کے پاس اس کا فن ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے زور پر وہ ایسے ممنوعات کے ہفت خواں سر کرتا جاتا ہے۔ ایک فکشن نگار کے پاس کہانی کا میدان، کردار اور اس کا ایک خاص ڈکشن ہوتا ہے، جس کے زور پر وہ اپنے آپ کو اس کہانی کا خدا سمجھتے ہوئے مختلف کرداروں کے کئی صنم تراشتا اور توڑتا ہے اور کئی ناقابلِ برداشت حقیقتوں کو ابلِ برداشت بنا کر بت شکنی کا کام بھی سرانجام دیتا ہے۔ قلعہ جنگی کے ساتوں کردار اپنا الگ الگ سیاسی، سماجی اور ثقافتی سیاق رکھنے کے باوجود ایک مخصوص مہابیانیہ سے جڑے ہوئے اور اس سے متاثرہ ہیں۔ ناول کا اہم مرکزی کردار جانی واکر، جو امریکی باشندہ ہے، وہ تصور کامل کی تلاش میں اپنا آبائی ملک و مذہب ترک کر کے افغانستان کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے۔ یہ مہابیانیے ہی کی طاقت ہے کہ جو ترکِ مذہب اور ترکِ وطن کے ساتھ آسائشات کو تج کر میدان کارزار میں آنے والے جانی واکر کو عبدالحمید سلمان فارسی بنا دیتی ہے۔ جانی واکر تصور کامل ایسے مہابیانیے کا متلاشی ہے، جسے وہ سب سے پہلے کمیونزم بعد ازاں اسلام میں پاتا ہے۔ جہاد افغان میں شرکت سے قبل جانی واکر کا اپنے والد سے بھرپور مکالمہ ایک مہابیانیے کی اثر و نفوذ پذیری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کسی مہابیانیے کی گرفت جس قدر مضبوط اور سحر انگیز ہوگی اس کا حلقہ اس قدر وسیع اور طاقت ور ہوگا۔ جانی واکر کا باپ جب اسے اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کرنے اور جہاد افغان کا حصہ بننے سے روکتا ہے تو وہ اسلام کے تصورِ کامل اور اس کی اثر انگیزی کا اسیریت کی حد تک کچھ یوں معترف ہے۔

> ”آپ بلیک مسلمز کو بے حد ایڈمائر کرتے تھے کہ یہ حیرت انگیز لوگ ہیں۔۔۔ ان میں سے بیشتر قاتل۔ غنڈے ڈاکو۔۔۔ زنا کے مرتکب اور الکوہلک تھے اور جیلوں میں بند تھے۔۔۔ اور پھر عالی جاہ محمد نے انہیں ایک راستہ دکھایا۔۔۔ پھر وہی لوگ صابر و شاکر ہوئے کہ باقاعدگی سے عبادت کرنے لگے۔ عورت اور الکوہل سے اجتناب کرنے لگے۔۔۔ گلیوں بازاروں میں کھڑے اپنے

> عقیدے کی ترویج کے لیے پمفلٹ بانٹتے تھے اور جب لوگ ان پر تھوکتے تھے تو وہ مسکراتے تھے اور کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔۔۔ مجھے اس مذہب میں ایک تصور کامل دکھائی دیتا ہے۔۔۔ پوری دنیا میں بدی کی قوتوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔۔۔ ایک نظام قائم کیا جائے جو عقیدے کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔"(۶)

مابعد جدیدیت ایسے تمام مہابیانیوں کی ردِ تشکیل کرتے ہوئے ان کی موت کا اعلان کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت تکثیریت پسند رویے کی حامل ہے۔ یہ تکثیری رویہ (Purelistic attitude) مہابیانیوں کی جگہ چھوٹے چھوٹے علاقائی بیانیوں اور سچائیوں اور بیانیوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ رولاں بارتھ کا یہ استدلال: کسی متن میں سے سکہ بند اور مرکزی معنویت کی تلاش عبث ہے، نے مابعد جدید رویے کو خاصی تقویت بخشی ہے۔ دریدا کی پس ساختیاتی فکر نے اسے پختہ کر دیا ہے۔ اس طرح کوئی صداقت صداقت نہیں رہتی اس میں بھی تکثیریت موجود ہوتی ہے۔ تارڑ نے اپنے ناول قلعہ جنگی میں مذہبی، جہادی، ثقافتی اور کئی سماجی اور کمیونسٹ مہابیانیوں کی ردتشکیل کی ہے۔

ردِ تشکیل کیا ہے؟ ردِ تشکیل متن میں موجود افتراقات کو تلاشتی ہے اور معنی کے مسلسل التوا پُر اصرار کرتی ہے۔ ردتشکیل کا کام متعینہ روایتی معنی کو بے دخل کرنا اور توڑنا ہے۔ سوسئیر کے نزدیک معنی کے انشراح کا منبع افتراقیت ہے تو وہیں دریدا کے ہاں معنی التوا سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ سوسیئر افتراقی رشتوں کی تلاش کے لیے Difference کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ سوسیئر افتراقی جوڑوں سے معنی کا انشراح کرتا ہے۔ دریدا نے Defferance ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے۔ اس کے معنی التوا، تعطل، یا تعلیق کے ہیں۔ دریدا مدلل طور پر کہتا ہے کہ فرق کرنے کے معنی ملتوی یا مدلل کرنے کے ہیں۔ معنی مسلسل غیر مختتم طور پر فرق کی بنیاد پر لفظ، در لفظ، در لفظ ملتوی ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ مستقل طور پر قائم رہتا ہے، الفاظ کے درمیان معنی کی جو نامکمل صورت ہے، دریدا اسے جھلکیوں (Traces) کا نام دیتا ہے۔ ان سے بھی معنی کی نمود ممکن ہوتی ہے۔ دریدا کے ہاں معنی کا اصل منبع مسلسل التوا deferment ہی ہے۔ ردتشکیل جہاں افتراقات سے معنی اخذ کرتی ہے وہیں Traces اور التوا سے بھی تہہ میں چھپے یا اَن کہے معنی کو دریافت کرنے کا عمل بھی ہے۔ ردتشکیل کے امام کے طور پر دریدا کو جانا جاتا ہے۔ ردتشکیل یا پس ساختیات کے ضمن میں ۱۹۶۶ء کو جان ہاپکنز یونیورسٹی میں ساختیات کے موضوع "The Languages of critics science of mind" پر منعقدہ کانفرنس میں دریدہ کا مقالہ بعنوان "Structure sign and play in discourse of human science" ایک واقعہ ثابت ہوتا ہے، دریدا کا یہ مقالہ ساختیات کے آغاز ہی سے اختتام ٹھہرتا ہے۔(۷) دریدا کسی بھی لفظ یا اس

کے مقررہ معنی کو مرکزیت دینے کی بجائے اسے ناپائید قرار دیتا ہے۔ دریدائی فکر بولی جانے والی زبان سے کہیں زیادہ لکھی ہوئی تحریر یا متن کی اہمیت کی قائل ہے۔ وہ زبان کے بدیہی اور استعاراتی نظام کی بنیاد پر معنی کی مضبوط بنیادوں کا تصور محال قرار دیتا ہے جس سے متن کی معیناتی موجودگی اور سیاق وسباق سے جڑا معنی کے تعین کا نظریہ رد اور فضول ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح معنی کی موجودگی اور عدم موجودگی مساوی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دریدا لفظ مرکزیت (Logocentrism) اور معنی کی مطلقیت کو ان کے خلاف دلائل سے چیلنج کرتا ہے۔ زمانہ قدیم میں معنی خیزی کا اصل ماخذ Logos کو گردانا جاتا تھا، دریدا اس نظریہ کی ردِ تشکیل کرتے ہوئے روایتی معنی کے جبر کو توڑ کر معنی کی تکثیریت سے ادب کو حقیقت کی تلاش میں فلسفہ کی سطح تک لے آتا ہے۔[۸] رد تشکیل مابعد جدیدیت کا ایک اہم پہلو تو ضرور ہے مگر اسے مابعد جدیدیت کے ہم معنی یا مساوی ہر گز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مابعد جدیدیت اس معنوی تکثیریت کو متن تک محدود نہیں ہونے دیتی۔ اس کا دائرہ کار ادب، تعمیرات، موسیقی، آرٹ اور دیگر فنون کے ساتھ ساتھ زندگی کے تمام شعبہ ہائے جات اور فکر و فلسفہ تک وسیع ہے۔

"قلعہ جنگی" کا کردار جانی واکر ہر عقیدے کو برین واشنگ قرار دیتا ہے جو کسی دوسرے مہابیانیے یا عقیدے کی ردِ تشکیل پر قائم کھڑی ہوتی ہے۔ جانی واکر ایک مہابیانیے کے رد اور اس سے گلو خلاصی پانے کے لیے ایک اور مہابیانیے میں پناہ لیتا ہے۔

> "ہر عقیدہ ایک برین واشنگ ہی تو ہے ڈیڈی۔ اگر ایسا نہ ہو تو مذہبی تاریخ میں کوئی نیا عقیدہ کبھی قبول نہ کیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی کیا اور پھر ہمارے پیغمبر نے بھی جو گزشتہ خیال اور بت تھے انہیں ذہنوں سے واش کر کے نئے خیال اور نئی سوچ کو داخل کیا۔"[۹]

یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ اکثر مہابیانیے کسی دوسرے سابقہ مہابیانیے یا نظریے کے رد پر بنیاد رکھتے اور استوار ہوتے ہیں۔ اصل میں یہ تردید ہوتی ہے، مگر اس تردیدی مہابیانیے پر اندھا یقین رکھنے والوں کے لیے یہ تردید اکثر ان کے ایقان میں مزید تقویت کا موجب بنتی ہے۔ مابعد جدیدیت مہابیانیے کا رد تو ہے، مگر یہ رد کسی اور مہابیانیے کی آڑ میں ہر گز نہیں کیا جاتا۔ مابعد جدیدیت مہابیانیوں کے رد کے بعد متبادل چھوٹے چھوٹے مقامی بیانیے پروان چڑھاتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ چھوٹے بیانیوں کو مہابیانیوں میں بدلنے سے کیسے؟ اور کیوں کر روکا جاسکے گا؟ لیوتار سائنسی اور مارکسی مہابیانیوں کی تقدیس اور اعتبار کو چیلنج کرتا ہے۔ جانی واکر ایک انقلابی مارکسی آدرش سے جڑا شخص اس مہابیانیے کی خامیوں کو اس کے اندر تک دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ جس کے بعد وہ مارکسی آدرش کو خیر باد کہہ کر ایک اور مہابیانیے میں پناہ

گزیں ہوتا ہے تو سابقہ مہابیانیے کی رد تشکیل کچھ یوں کرتا ہے کہ ایک مہابیانیے کی خامیاں اور کمزوریاں دوسرے مہابیانیے کی خامیوں سے بڑھ چڑھ کر سامنے آتی ہیں۔جانی واکر اشتراکیت اور طالبانائزیشن ایسے مہابیانیوں کا موازنہ کرتا ہے۔یہ موازنہ ایک مہابیانیے کے رد پر دوسرے مہابیانیے کو استوار کرتا ہے:

”وہ (طالبان) بے شک قدرے گمراہ ہیں لیکن اپنے مقصد کے حصول کے لیے۔۔۔ اپنے تصور کامل کے لیے کھڑے ہیں۔۔۔ ان میں جہالت بے شک ہے لیکن کھوٹ نہیں۔ وہ مکمل اختیار رکھنے کے باوجود ایماندار ہیں اور ان پر بے شک سو الزام سہی لیکن کرپشن کا الزام نہیں۔۔۔ انہوں نے تاریخ میں پہلی بار اپنے ملک کو ہتھیاروں اور افیم سے پاک کیا ہے۔ عورتوں کے حقوق چھینتے ہیں لیکن ان کو ایک غیر متوقع احترام اور عزتِ نفس لٹاتے ہیں۔۔۔ بے شک وہ قدرے بھٹکے ہوئے ہیں لیکن ایک تصور پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ آپ کی نسل کی مانند۔۔۔ آپ کی نسل نے بھی تو کمیونزم کی جہالت اور ظلم کو صرف اس لیے برداشت کیا کہ آپ کے سامنے ایک بڑا مقصد تھا جس کے حصول کے لیے یہ سب کچھ جائز ٹھہرتا تھا۔۔۔ آپ کی پسندیدہ ریاست نے بھی تو لاکھوں لوگوں کو قتل کیا۔۔۔ دہشت کو آپنا آئین بنایا۔ ٹروٹسکی کو مرتد ٹھہرایا اور قتل کیا۔۔۔ آپ (کمیونسٹ) اپنے عقیدے کی پختگی میں ان ملائوں سے بدتر تھے کیونکہ آپ سب تو پڑھے لکھے تھے اور اس کے باوجود مارکس کے ترازو پر جو پورا نہ اترتا تھا اسے بید سے نہیں مارتے تھے جان سے مار دیتے تھے۔۔۔ آپ بھی گمراہ تھے اپنے وقت کے طالبان تھے۔“(۱۰)

مابعد جدیدیت ہر طرح کے مذہبی ثقافتی مہابیانیے کی مانند مارکسی مہابیانیے کو بھی رد کرتی ہے۔مارکسیت بھی اپنے آپ کو مکمل اور مطلق سچائی کے طور پر پیش کرنے پر بضد ہے۔مارکسی نظام کی ناکامی کا ایک سبب مذکورہ بالا پہلو بھی ہے۔مابعد جدید صورت حال کسی بھی مفروضہ سچائی یا تصورِ کامل کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

موت قریب ہو تو کچھ نہیں سوجھتا، جہاں تمام حسیات جواب دے جاتی ہیں، وہیں کچھ ایسی خوابیدہ حسیات بھی بیدار ہوتی ہیں جو ادراک کے نئے در وا کرتی ہیں۔شاید اشیا کو دور سے دیکھنے کا ایک سحر انگیز رومانس ہوتا ہے، جس کے زیرِ اثر وہ چیز دور سے سہانی لگتی ہے۔قربت خوبیوں کے ساتھ عیوب کو بھی آشکارا کرتی ہے۔ جانی واکر اور اس کے ساتھی قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں اپنے ساتھیوں سمیت مردہ گھوڑے کے کچے گوشت پر جسم و جان کا رشتہ جوڑے رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔وہ ساتوں ایک ہارے ہوئے کھلاڑی کی مانند سارے کھیل تماشے کو بھانپ چکے ہیں۔نیم مردہ حالت میں انہیں تہہ خانے کی تنہائی میں سوچ بچار کا موقع ملتا ہے۔ زندگی کی حدت کے ساتھ ساتھ بھڑکتے ہوئے جذبات کی آگ سرد ہوئی چاہتی ہے۔زندگی کی راکھ کریدنے کی

کوشش کرتے ہیں تو ان کے اندر جو نا قابلِ تردید مہابیانیے جاں گزیں تھے، بھسم ہو چکے ہیں۔ ان نظریات کی دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی تھیں جو اب شگافوں کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ یہ کردار مفروضہ سچائی سے کوسوں دور ہیں اور کئی مہابیانیوں کی رد تشکیل کرتے نظر آتے ہیں۔ جانی واکر جو سب سے زیادہ اس تصور کامل کے بخار میں مبتلا تھا اب علی الاعلان تردید کرتا نظر آتا ہے۔(۱۱) طالبانائزیشن کو تقویت دینے کے لیے لازم تھا کہ زندگی کے مقابلے میں موت یعنی شہادت کے بیانیے کو فروغ دیا جائے۔ زندگی کو عارضی قرار دے کر جینے کے مقابلہ میں موت کو رومانوی انداز میں پیش کیا جانا انتہائی ضروری تھا، ورنہ مطلوبہ نتائج کا حصول ناممکنات میں سے ہو جانا تھا۔ اس مقصد کے لیے مذہبی ملائوں اور مذہبی بیانیے سے بخوبی استفادہ کیا گیا۔ ملائوں نے اپنے مکر اور سحر سے سادہ لوح لوگوں کو زندگی کے مقابلے میں موت کے قریب کر دیا اور خود پیچھے رہ گئے۔ شیر محمد کی لاش سے ٹکرانے سے اللہ بخش کو یاد آتا ہے کہ وہ یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ باپ کی خوشی کے لیے یہاں تک پہنچا تھا۔ اللہ بخش کو یاد آتا ہے کہ جب شیر محمد کا بھائی کشمیر میں شہید ہوتا ہے اور اس کی لاش گجرات کے گائوں میں پہنچتی ہے تو وہ برادری کو رونے اور سوگوار ہونے سے منع کر دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ یہ بیٹا تو کیا چھوٹے بیٹے کو بھی جہاد پر روانہ کر کے اس کی شہادت کے لیے دعا کروں گا۔(۱۲) آج والد کی دعا سنی گئی تھی کہ شیر محمد کے ڈیزی کٹرز نے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اللہ بخش کی موت پر گل شیر ولی اس کی لاش کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے تدفین کی بات کرتا ہے تو مرتضیٰ غصے سے جھلا کر جنت دوزخ اور شہادت کے بیانیے کو رد کر دیتا ہے جو انہیں یہاں تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں:

”اوپر صحن میں سینکڑوں کی بے حرمتی ہو رہی ہے، اس کے بارے میں کیا کہتے ہو خان صاحب۔۔۔
ادھر کوئی حرمت، کوئی بے حرمتی نہیں۔۔۔ کوئی جنت، کوئی دوزخ نہیں۔۔۔ اور کوئی شہادت نہیں
جس کی آرزو میں ہم ادھر آئے تھے۔۔۔ صرف بو ہے اور موت ہے۔“(۱۳)

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ شہید کی موت پر لطف ہوگی، شہید چاہے گا کہ وہ دنیا میں بار بار جائے اور شہادت کا جام نوش کر کے لطف لے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ شہید کو راہ خدا میں جان دینے کی اتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی جس قدر چیونٹی کے کاٹنے سے ہوتی ہے۔ قلعہ جنگی میں موت کی تلخی میں مبتلا افراد کی حالت زار کے پیش نظر ناول نگار نے شہادت اور عام موت کے درمیان فرق کرنے کی بجائے موت کو ایک سا تلخ تجربہ قرار دیا ہے جس سے شہید کی آسان موت کے بیانیے کی رد تشکیل ہوتی ہے۔ شہادت کی موت بھی کوئی آسان معاملہ نہیں رہتا، جس قدر اسے آسان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ زندگی ایسے نایاب جوہر کا خاتمہ کوئی آسان کام نہیں اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

> ”قلعہ جنگی کے صحن کے اوپر غبار معلق تھا۔۔۔اس غبار تلے سینکڑوں لاشے تھے۔۔۔ جان بے شک شہادت سے نکلے مشکل سے نکلتی ہے۔ موت یہ نہیں پرکھتی کہ یہ جنت کا آرزو مند ہے یا کافر ہے یا منکر ہے وہ اپنی اذیت کم نہیں کرتی۔۔۔ جان بیلنے میں آئے ہوئے گنے کی مانند نچڑتی ہے۔۔۔ جن کے بدن نسبتاً سلامت رہے تھے۔ وہ پورے کے پورے پھڑک رہے تھے اور جو اتنے خوش قسمت نہیں ان کے اعضا ٹھنڈے نہیں ہوتے تھے اور وقفوں وقفوں سے تھر تھراتے تھے۔“(۱۵)

شہید کی فضیلت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ انہیں مردہ نہ کہو انہیں مرنے کے بعد بھی رزق ملتا ہے۔ قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں موجود ان سات نفوس پر جیتے جی رزق تنگ ہو گیا۔ وہ مرنے کے بعد ملنے والے رزق کے وعدے سے متعلق متشکک ہیں۔(۱۴) اور اس تہہ خانے میں ان کے رزق کا وسیلہ صرف اور صرف وہی ایک مردہ گھوڑا ہے۔

ہر مذہب کا حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا اپنا ایک الگ تصور اور فلسفہ ہے۔ ہر مذہب اپنے پیرو کاروں کے لیے کھانے پینے اور عملی طور پر کرنے کرانے کے معاملات میں کچھ حدود کا تعین کرتا ہے۔ ان حدود سے تجاوز سرکشی شمار ہوتی ہے اور اسے کسی طور برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ بھوک اور مزید بڑھتی بھوک سے قریب ہوتی موت حلال و حرام کے بیانیے کی رد تشکیل کر دیتی ہے۔ ”قلعہ جنگی“ کے تہہ خانے میں چھپے سات نفوس بھوک کے راستے سے قریب آتی موت کو بھانپ لیتے ہیں۔ وہ شہادت کی موت سے مرنے کی بجائے جینا چاہتے ہیں۔ خالقِ حقیقی سے ملنے کے لیے بے تاب ہونے کی بجائے اس دن کی زندگی کے لیے حریص نظر آتے ہیں۔ جان و جسم کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے کھانے پینے کا عمل ناگزیر ہے۔ وہاں تو ان جیسے انسانوں کی لاشوں کے سوا کچھ موجود نہیں، گل شیر ولی کا ذہن اوپر پڑی لاشوں کی طرف دوڑتا ہے۔ گھوڑے کی ہنکار سب کے من میں جینے کی ماند پڑتی امنگ جگا دیتی ہے۔ وہ اوپر جا کر گھوڑے کو قابو کر کے تہہ خانے میں لے آتے ہیں کیونکہ وہ شہید ہونا نہیں چاہتے وہ جینا چاہتے ہیں۔ گھوڑے کو کھانے کے مقصد کے لیے قابو کرنے سے پہلے وہی حلال و حرام کا مذہبی بیانیہ کچھ لمحہ آڑے آتا ہے، مگر پھر بھوک اور موت کا خوف حلال و حرام کے بیانیے پر غالب آجاتا ہے۔

> ”گھوڑا حلال ہوتا ہے؟“، ”اگر نہیں بھی ہوتا تو کیا تم نہیں کھاؤ گے۔۔۔“، ”کھاؤں گا“۔۔۔ ”مجھے بھوک نہیں۔۔۔ پیاس لگی ہے“۔۔۔ ”یہ پیاس بھی بجھ سکتی ہے۔“، ”کیسے بھائی مرتضیٰ؟“، ”گھوڑے کا خون بھی تو پیا جاسکتا ہے۔“، ”خون تو حرام ہوتا ہے۔۔۔“، ”نہیں پیو گے؟“، ”پیوں گا۔“(۱۷)

پچھے نفوس تو گھوڑے کے گوش کے کچے پارچے کراہت کے ساتھ نگلتے ہیں، مگر جانی واکر جو نومسلم ہے وہ اپنے عقیدے میں کچھ زیادہ ہی پختہ ہے، حرام کھانے پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ اسے بھی ناول میں دو حرام افعال میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ جب گھوڑا کھینچ تان کر تہہ خانے میں لایا جاتا ہے تو وہ پیشاب کر دیتا ہے۔ جانی واکر اس کے گرم گرم پیشاب میں لوٹنے لگتا ہے، تاکہ گھوڑے کے پیشاب کی اینٹی سیپٹک خصوصیات سے اس کے خراب ہوتے زخم مندمل ہو جائیں۔ دور کہیں شمالی والے "قلعہ جنگی" کے معرکے کو سر کرنے کی خوشی میں سازوسرود کی محفل برپا کیے ہوئے ہیں، جس کی آواز جانی واکر کے اندر تک اتر جاتی ہے۔ وہ اس ان جانی اور نامانوس دھن میں مگن ہو جاتا ہے اور سر دھننے لگتا ہے۔ "حالت کفر میں مبتلا بدنی نظام اسے بے اختیار کرتا ہے۔"[۱۸]

ناول میں ہاشم میر کے والد کا کردار ایک مذہبی منافق کردار ہے جو مذہب میں اپنے مفاد اور من پسند کے پہلو اپنا لیتا ہے، ایسے کئی کام جن کے لیے مذہب نے حدود مقرر کی ہیں، انھیں اپنے مفادات کے پیش نظر رد کر دیتا ہے۔ وہ دکھاوے کے تمام کام پورے خشوع و خضوع سے انجام دیتا ہے۔ وہ باقاعدہ نماز ادا کرتا ہے، مقامی مسجد کی تعمیر میں حصہ ڈالتا ہے۔ خود بھی شراب نہیں پیتا اور دوسروں کو بھی بیئر پینے سے منع کرتا ہے۔ گوریوں کا رسیا ہے۔ گوریوں سے مسلسل ہم بستری کو عیسائیت پر اسلام کی برتری گردانتا ہے۔ ایک سٹور میں سے اپنا حصہ اس لیے نکال لیتا ہے کہ وہاں سور کا گوشت اور شراب فروخت کی جاتی تھی۔ ٹکٹ چیکر کی عدم موجودگی میں ٹکٹ خرید کر ٹرین میں سفر کرنے کی اخلاقی جرات کبھی نہیں کی۔ بریڈ فورڈ میں مولویوں کو مدعو کرتا، ان کا واعظ خود بھی سنتا اور بچوں کو بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ غیر قانونی تارکین وطن کو تہہ خانے میں جگہ دیے ہوئے ہے، ان سے کام لیتا اور ان کا استحصال کرتا ہے جب کبھی وہ چوں چرا کرنے لگتے تو انھیں قانون کے حوالے کیے جانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ وہ اپنی تمام تر انرجی برطانوی ویل فیئر سے پورے طور پر استفادے کے لیے صرف کر دیتا ہے۔ روزگار ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بیکار ڈکلیئر کرا کے چیکوں کا حصول جائز سمجھتا ہے۔ والدہ کو اپاہج قرار دلوا کر حکومتی اور معاشرتی بہبود کی انجمنوں سے رقم اینٹھتا ہے۔[۱۹] مگر ہے وہ پکا سچا مسلمان۔ دراصل یہ سارا فکری و عملی تضاد اس سارے مذہبی نظام کی رد تشکیلیت سے جا جڑتا ہے جس پر انسان عمل پیرا ہوتا ہے۔

موت شاید انسان کو کچھ زیادہ حقیقت پسند بنا دیتی ہے، کیونکہ خود موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اب وہ تمام اس قابل ہیں کہ مہابیانیوں پر بھی سوال قائم کر سکیں۔ ایسے مہابیانیوں کو چھیڑنا موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ ایسے مہابیانیوں کے اسیر کسی کو اس حوالے سے سوال اٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں

دیتے۔ ان ساتوں کے سروں پر موت منڈلا رہی ہے، اب اس سے بڑا ڈر تو ہے نہیں کہ جو انہیں ایسے مہابیانیوں کو چیلنج کرنے سے باز رکھ سکے۔ بات بامیان کے زائد المعیاد خداؤں کی طالبان کی طرف سے عملی ردِ تشکیل سے شروع ہوتی ہے اور جس کی تان آج کے حقیقی اور خود ساختہ خداؤں پر آن ٹوٹتی ہے۔

"اور کس نے کہا تھا کہ وہ متروک خدا تھے؟"، "میں نے۔۔۔" بیگ نے فوراً جواب دیا۔ "بیگ۔۔۔ کیا زمانے بدلنے۔۔۔ وقت کے گزرنے سے خدا بھی متروک ہوتے جاتے ہیں؟" "ہاں"۔۔۔ "تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارا آج کا خدا آج سے دو ہزار برس بعد متروک ہو جائے اوران زمانوں کے لوگ اس کے تصور کو مسمار کر دیں؟"، "لاحول ولا۔" عبدالوہاب بڑبڑایا۔۔۔ اور پھر فوراً مسکرایا۔۔۔ "کیا یہ ممکن ہے بیگ"، "تم کفر بک رہا ہے یارا۔۔۔ ہمارا رب ہمیشہ کے لیے ہے۔۔۔"، "بدھ کے پجاری بھی بامیان کے مجسموں کے سامنے سر جھکاتے تھے تو یہی یقین رکھتے تھے کہ یہ ہمیشہ کے لیے ہے۔"، "وہ تو راہ راست سے بھٹکے ہوئے کافر تھے، پر میں گارنٹی کرتا ہوں یارا کہ ہمارا رب ہمیشہ کے لیے ہے۔۔۔ یہ کبھی متروک نہیں ہوگا روزِ حشر تک"، "کیا گارنٹی ہے؟"، "اوئے یہ کون ہے جو اللہ میاں کے لیے گارنٹی مانگ رہا ہے؟"، اللہ بخش غضبناک ہو گیا۔ "میں تو نہیں تھا۔"، "میں بھی نہیں تھا؟"، "تو پھر کون تھا؟" "کوئی بھی نہیں تھا۔"[۲۰]

مابعد جدیدیت عظیم مہابیانیوں پر سوال قائم کرنا اور انہیں چیلنج کرنا سکھاتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مہابیانیوں کی شکست و ریخت، ان کا زائد المعیاد ہو کر متروک ہونا مابعد جدید رویے کو تقویت دیتا ہے۔ مذکورہ بالا مذہبی مہابیانیے ہیں، جن کی حقانیت پر سوال اٹھانا تو درکنار اس سے متعلق بات کرنا بھی ممنوعہ موضوع ہے۔ مابعد جدیدیت نے ہر مہابیانیے کو رد کیا ہے۔ ہمہ گیر مہابیانیوں کی جگہ تکثیریت کے حامل چھوٹے چھوٹے مقامی، ثقافتی بیانیے متعارف کرائے ہیں۔ ناول میں مہابیانیوں کی جگہ چھوٹے بیانیے جگہ بناتے نظر آتے ہیں۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جو تمام عالمِ اسلام کو ایک ملی وحدت کی لڑی میں پروتا ہے۔ ہر رنگ نسل، زبان اور علاقائی تقسیم سے بالاتر ہے۔ عملی طور پر زندگی میں اس سے برعکس معاملات کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اکثر دفعہ رنگ نسل علاقہ یا زبان مذہب سے بھی پہلے کی چیزیں بن کر سامنے آتی ہیں۔ جانی واکر امریکی سفید فام ہے، جس کی زبان انگریزی ہے۔ وہ باقی چھے میں سے سب سے زیادہ ہاشم کے نزدیک رہتا ہے۔ ہاشم برطانوی نژاد پاکستانی ہے مگر برطانیہ کے ماحول و ثقافت میں پلا بڑھا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مزاج شناس ہیں۔ ان دونوں کا الگ ہو کر انگریزی بولنا، الگ مزاج و حس مزاح کا حامل ہونا باقیوں کو کھٹکتا ہے۔ جانی واکر اپنا سب کچھ چھوڑ کر آیا ہے۔ دھن دولت ملک عقیدہ مذہب سب کچھ، مگر پھر بھی باقی لوگ اسے ایک امریکی گورے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔[۲۱] جانی سے اختلاف رائے سے کہیں زیادہ زبان، ملک اور نسل کا امتیاز روا رکھے ہوئے ہیں۔

دیر کا رہنے والا پختون گل شیر ولی اپنی پختون روایات سے پورے طور واقف ہے، کہ طالبان ہمیشہ سے لڑتے آئے اور صلح بھی کرتے آئے ہیں، مگر وہ ہمیں معاف نہیں کریں گے۔ ہم اسلام کی خاطر اسلام کے لیے اس سرزمین پر اترے تھے۔ طالبان اور شمالیوں کی صلح مقامیت کی بنیاد پر ہونی ہے۔ وہ صدیوں سے لڑتے بھی آئے ہیں اور ایک ساتھ بستے بھی آرہے ہیں۔ افغانوں کو مذہب کا رشتہ آپس میں برسرپیکار رکھے ہوئے ہے مگر زمین کا رشتہ انہیں آپس سے جدا نہیں ہونے دیتا اور دوبارہ جوڑ دیتا ہے۔ طالبان جب آپس میں بدلہ لیتے ہیں تو مذہب کو بلائے طاق رکھ دیتے ہیں اور مذہب پر علاقائیت اور مقامیت غالب آجاتی ہے۔

> ''یہ جو شمالی والے ہیں۔۔۔ تاجک، ازبک اور ہزارے ہیں، کچھ طالبان سے تو بدلہ لیتے تھے اور بیشتر کو گلے لگا کر برابر میں بٹھاتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو ہمارا بھائی ہو۔ ہمارا ہم وطن ہو۔۔۔ ہم تو ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرتے آئے ہیں۔ کبھی ہم جیت جاتے ہیں اور کبھی تم لیکن یہ غیر ملکی یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔''[۲۲]

ناول میں طالبان کے مہابیانیے کے اسیر اور شکار سمجھ بوجھ رکھنے اور اندھی تقلید کرنے والے، دونوں ہی نظر آتے ہیں۔ سمجھ بوجھ رکھنے والوں میں عبدالوہاب، میر ہاشم اور جانی واکر ہیں۔ یہ وہ کردار ہیں جو زندگی کے کسی ایک مہابیانیے سے چھٹکارا پانے کے لیے، یا سابقہ زندگی کے کفارے کے لیے طالبانائزیشن کے انسان سوز مہابیانیے میں آن پناہ لیتے ہیں۔ مرتضیٰ پاکستانی جہاد افغان کو کمانڈ کرنے والے ایک جرنیل ارتضیٰ کا بیٹا ہے جو جہاد کے نام پر کھڑی ہونے والی انڈسٹریل ایمپائر اور سیف ہاؤس ایسے عیاشیوں کے اڈوں سے مستفید ہو چکا ہے۔ زندگی کی لایعنیت کی خلش اسے یہاں تک لاتی ہے اور وہ اپنی زندگی کو جواز دینا چاہتا ہے۔ سابقہ زندگی کے کفارے کے لیے یہاں تک پہنچا ہے، مگر علم نہ تھا کہ اسے اس قدر بھاری خراج دینا ہوگا۔ میر ہاشم اور جانی واکر بھی تمام سہولیات کو تج کر زندگی داؤ پر لگا کر سابقہ زندگی کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔[۲۳] مگر یہاں پہنچ کر ان کی آنکھیں کھلتی ہیں کہ یہ کیسا تصور کامل ہے جو اپنے ہم شبیہ، ہم مذہب اور ہم عقیدہ لوگوں کے قتل کو جہاد کا نام دیتا ہے۔ خود قتل ہوں تو شہید اور جنت کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور مخالف قتل ہو کر جہنم واصل ہوتا ہے۔ جانی کا باپ طالبان کے انسانیت سوز مہابیانیے کی رد تشکیل کرتا ہے۔ طالبان وہ وحشی ملاں ہیں جنہوں نے انسانیت کو پتھر کے دور میں دھکیل دیا ہے جہاں رباب بجانا جرم ٹھہرتا ہے، کھلاڑیوں کے سر مونڈھے دیے جاتے ہیں، کہ ان کی نکروں سے نظر آتی ٹانگوں سے ملاؤں کے ایمان خراب ہوتے ہیں۔ عورت کا حال سب سے برا ہے، انہیں برقعوں میں دفن کر دیا گیا ہے۔ ہسپتالوں میں لیڈی ڈاکٹروں سے علاج کرانا خلافِ شرع قرار دے کر ان کی چھٹی کرا دی گئی ہے۔ اب وہ بھوکوں مرتی اور برقعے اوڑھے کابل کی گلیوں میں بھیک مانگتی پھرتی ہیں۔ عورت

کے ٹخنے نظر آ جائیں تو اسے سر بازار پیٹا جاتا ہے، گالیاں دی جاتی ہیں۔ مردوں کی ڈاڑھیاں پکڑ کر ہاتھوں میں بھینچی جاتی ہیں۔ بال مٹھی سے باہر نہ نکلیں تو انہیں بید سے مارا جاتا ہے۔ فوٹو گرافی کی ممانعت ہے، ٹیلی ویژن توڑ دیے گئے ہیں۔ صنعت تجارت اور تعلیم سب ختم کر دی گئی ہے۔(۲۴) صرف اللہ کا نام باقی ہے۔ افغانستان پہنچ کر عبدالوہاب، میر ہاشم اور جانی واکر ایسے متلاشیوں کا کا تصور کامل برابر پاش پاش ہو چکا ہے۔ طالبان دوبارہ اقتدار میں آنے پر پہلے سے بہت مختلف ہیں۔ اب ٹیلی ویژن توڑنے کی بجائے اپنے ذاتی ٹی وی چینل بنا چکے ہیں۔ بین الاقوامی چینلوں کی خواتین نمائندوں کو انٹرویو دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خواتین کے معاملے میں بھی کچھ حد تک نرم گوشہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اب عالمی کھیلوں میں افغانستان کی نمائندگی بھی نظر آتی ہے۔ ہم اب مابعد جدید صورت حال سے نبرد آزما ہیں جہاں ہر فکر و عمل مسلسل تغیر پذیر ہے۔ طالبان کیوں کر اس سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ طالبان کے فکر و عمل میں یہ تغیر سابقہ فکر و عمل کی اپنے ہاتھوں سے ہی رد تشکیل ٹھہرتا ہے۔

ناول میں کئی سماجی و عوامی و ثقافتی اور شعری بیانیوں کی ردِ تشکیل بھی کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں کچھ خاص قوموں اور ذاتوں سے جڑے بیانیے عام ہیں۔ انہیں ان بیانیوں کی روشنی میں دیکھا بھالا اور پرکھا جاتا ہے۔ کئی ذاتوں کو بہادر، دلیر، کئی کو ڈرپوک اور کئی کو کنجوس یا بے وقوف گردانا جاتا ہے۔ ان سے متعلق کئی طرح کے لطائف گردش میں ملیں گے۔ پٹھانوں کو غیور طاقت ور اور مضبوط تصور کیا جاتا ہے۔ مقامی سطح پر یا کسی مستشرق نے اس قوم کی تاریخ رقم کی تو انہیں ایسے ہی القابات سے ہی نوازا ہے۔ دیر سے تعلق رکھنے والا کردار گل شیر ولی اس بیانیے کی کچھ یوں رد تشکیل کرتا ہے۔

> "یہ باہر کا انگریز لوگ جب ہمارے بارے میں کہانی بناتا ہے تو لکھتا ہے کہ یہ پٹھان قوم بہت طاقتور اور مضبوط ہوتا ہے اور کسی کے سامنے جھکتا نہیں تو اس بٹی چو کو کیا پتہ کہ دو چار پٹھان تو ایسا ہوتا ہے پر باقی سب نواب اور خان کے سامنے جھکتا ہے۔ ویسا ہی ہوتا ہے جیسے بنگال کا بھوکا اور غریب ہوتا ہے۔۔۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔۔۔ باہر بیٹھ کر کہانی بناتا ہے۔ کبھی میرے جیسا اصطبل والا لوگ کو نہیں ملا۔"(۲۵)

ایک بیانیہ یہ بھی ہے کہ جنگیں ہتھیاروں سے نہیں بلکہ جذبوں سے لڑی اور جیتی جاتی ہیں۔ مومن بے تیغ سپاہی بھی ہو تو وہ خود نہیں بلکہ اس کا حوصلہ اور جذبہ لڑتا ہے۔ ہتھیاروں پر تو صرف کافروں کا یقین ہوتا ہے۔ اس کا سبب اس کا خدا پر کمزور ایقان ہے۔ اس بیانیہ کو تقویت دیتا محمد اقبال کا مشہور زمانہ شعر بھی ہے۔ جسے ایسے مقاصد کے حصول اور ہوش پر جوش کے غلبے کے حصول کے لیے برتا جاتا رہا ہے:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ لڑتا ہے سپاہی

یہ بیانیہ عقلی بنیادوں پر حقائق کے بالکل برعکس ہے اور یہ بیانیہ اس کے مرتب کرنے اور اسے پروان چڑھانے والوں کے بھی سراسر خلاف جاتا ہے۔ اس کا مقصد سادہ لوح لوگوں کو جذباتی کر کے، انہیں بے وقوف بنا کر، ان سے جنگی ایندھن کا کام لینے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس بیانیے کے اسیر جب میدانِ جنگ میں اترتے ہیں اور مد مقابل جدید ہتھیاروں سے لیس ہوتا ہے تو ان کا حشر کچھ یوں ہوتا ہے۔

"قندوز میں ہمارا بہت لوگ شہید ہوا۔ تلوار والا جتنا تھا، وہ سب شہید اہوا۔۔۔ وہ نعرہ تو ایسا لگا تا تھا کہ شیر کے موافق لگتا تھا لیکن خندق سے نکلتا تو واپس خندق میں آ گرتا تھا۔۔۔ یارا ہم کیا کرتا۔۔۔ اوپر سے بم گرتا تھا۔۔۔ ہمارے سے بہت دور گرتا تھا تو ادھر ہمارے کان اور منہ سے اور ناک سے خون نکلنے لگتا تھا۔ اتنے زور کا دھماکہ کرتا تھا۔۔۔ سامنے سے اتنی گولی آتا تھا کہ ہم سر اٹھاتا تو اس میں لگتا تھا۔ ہم کیا کرتا۔۔۔ ہم نے ہتھیار ڈال دیا۔"(۲۶)

افغانستان کو اسلام کا مضبوط قلعہ قرار دیا جاتا ہے۔ افغانستان کے بلند و بالا سنگلاخ پہاڑ ہیں جن کو سر کرنا باہر سے آنے والی قوتوں کے لیے کبھی آسان نہیں رہا۔ مقامی جنگجو اپنی اس علاقے سے متعلق جان کاری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گوریلا جنگ لڑنے والوں کے لیے سب سے اہم یہ ہوتا ہے کہ جس علاقے میں وہ حملے کریں اس کے ایک ایک چپے سے واقف ہوں اور مقامی لوگوں کا تعاون بھی حاصل ہو۔ طالبان کی سوویت فوج پر برتری کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ افغانستان کو اسلام کا ناقابلِ تسخیر قلعہ قرار دیا جاتا رہا۔ اس کو ناقابل تسخیر بنانے میں اس ملک کے پہاڑوں، ان میں موجود خفیہ راستے اور غاریں اہم ہیں۔ جب تک یہ کوہسار قائم ہیں افغانستان قائم ہے۔ محمد اقبال کا شعر ہے:

افغان باقی ، کہسار باقی
الحکم اللہ ، الملک اللہ

جدید دور میں جدید ہتھیاروں نے جنگ کے انداز بدل دیے ہیں۔ اقبال کا قائم کردہ یہ بیانیہ بھی امریکی ہوائی طیاروں اور ڈرون حملوں کے بعد خطرے سے دوچار نظر آتا ہے۔

"شمال والے قندوز اور مزار کے بعد کابل کی جانب بڑھنے کی تیاریوں میں مگن تھے۔۔۔ امریکی طیارے دن رات اس مفروضے کو باطل ثابت کر رہے تھے کہ کوہسار باقی افغان باقی۔۔۔ نہ کوہسار تاب لا رہے تھے اور نہ افغان، کارپٹ بومبنگ سے چپہ چپہ ملیامیٹ ہو رہا تھا۔۔۔ اور کابل کے

راستے میں جتنی بھی آبادیاں تھیں، دیہات تھے، انہیں ڈیزی کٹر۔ کلسٹر اور بنکر لسٹر دفن کر رہے تھے۔"(۲۷)

موجودہ صورتِ حال میں امریکہ کا رات کی تاریکی میں چوروں کی مانند بھاگنا اور طالبان کا از سر نو منظم ہو کر طاقت میں آنا کئی سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ کیا امریکی سپر پاور کا مہابیانیہ بھی رد تشکیلیت سے گزر رہا ہے؟ جیسے روسی سپر پاور کی رد تشکیل ہوئی تھی یا اس سب کے پیچھے سپر پاور کے کوئی اور ہی عزائم و مقاصد پوشیدہ ہیں؟ کیا طالبانائزیشن کا شکست خوردہ مہابیانیہ از سر نو زندہ ہو چکا ہے؟ یہ مابعد جدید صورت حال ہے، جہاں ہر لمحہ صورت حال تغیر پذیر ہے۔ اس صورت حال میں مہابیانیے معدوم بھی ہو رہے ہیں۔ معدوم مہابیانیے از سر نو زندہ اور چھوٹے چھوٹے مقامی بیانیے مہابیانیوں کا روپ بھی دھار رہے ہیں۔ امریکی ادبی نقاد، مابعد جدید مفکر اور ثقافتی نظریہ ساز جیمی سن لیوتار سے اختلاف کرتا ہے۔ اس کے مطابق مابعد جدید دور میں مہابیانیے معدوم نہیں ہوئے بلکہ یہ مہابیانیے پسپا ہو کر ہمارے لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مہابیانیہ موجود ہوتا ہے مگر اسے دبا دیا جاتا ہے۔ جیمی سن کا خیال ہے کہ یہ مہابیانیہ مابعد جدید دور میں بھی کسی نہ کسی انداز میں زندہ رہتا ہے۔(۲۸) حالات ساز گار ہونے اور موقع ملنے پر سامنے آ کر اپنی طاقت اور اثر انگیزیزی کا اظہار یہ بنتا ہے۔ آنے والا وقت بتائے گا کہ طالبانائزیشن کا مہابیانیہ دوبارہ زندہ ہو گیا ہے یا امریکی استعماری بیانیے نے کوئی نیا رخ بدلا ہے۔

اردو ناول نگاری میں ایک خاص رجحان عام ہے کہ کہانی کی بنیاد کسی خاص مہابیانیے کو بنایا جاتا ہے، پھر تمام ناول کا پلاٹ اس مہابیانیے کے دفاع، توضیح و تشریح اور حمایت پر قائم کیا جاتا ہے۔ جہاں فن کا مہابیانیوں کو تقویت پہنچانے میں اہم کردار نظر آتا ہے وہیں مابعد جدیدیت ایسے مہابیانیوں کو سرِ عام چیلنج بھی کرتی ہے۔ "قلعہ جنگی" ناول ایک ایسے واقعہ پر بنیاد رکھتا ہے جو ایک خون آشام واقعہ ہے۔ اس واقعہ کا تعلق ۲۵ نومبر سے یکم دسمبر ۲۰۰۱ء کے سات دنوں سے ہے۔(۲۹) قندوز میں شمالی اتحاد کے جنرل رشید دوستم کے سامنے حریف طالبان ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور انہیں قلعہ جنگی میں لے جایا جاتا ہے، جہاں وہ بغاوت کر دیتے ہیں۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے امریکی طیارے آسمان سے ڈیزی کٹر بمب گرا کر اس قلعہ کو لاشوں کے صحرا میں بدل دیتے ہیں۔ اس ساری صورت حال میں سات خوش قسمت، جنہیں خوش قسمت سے زیادہ بد قسمت کہیں تو بے جا نہ ہو گا، تہہ خانے میں پناہ لیتے ہیں۔ تارڑ نے اپنے ناول کی بنیاد ہی ایسے بیانیے پر رکھی ہے جو پہلے ہی سے شکست خوردہ ہے اور رد کیا جا چکا ہے۔ اس ناول کے ساتوں کردار شکست خوردہ ہیں، جن میں بھڑکتے مہابیانیوں کی آنچ ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ وہ قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں ان عظیم مہابیانیوں کے بخیے چاک کرتے

ملتے ہیں۔ تارڑ کا ناول ’’قلعہ جنگی‘‘ نو تاریخیت اور بیانیوں کی بے رحمانہ رد تشکیل کے سبب اردو کے اہم مابعد جدید ناولوں کی صف میں جا شامل ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1. اقبال آفاقی، مابعد جدیدیت(اصطلاحات اور معانی و تعبیرات و تشریحات، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۶ء)،ص ۱۶
2. Lyotard, Jean-Francois, ***The Modern Condition***, (America, United Kindom: Manchester University Press, 1979), P No. 49
3. اقبال آفاقی،ڈاکٹر،مابعد جدیدیت:فلسفہ تاریخ کے تناظر میں،(فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۳ء)،ص ۱۸۹
4. اشتیاق احمد،ڈاکٹر،پاکستان عسکری ریاست،مترجم:ایم وسیم،(لاہور: مشعل بکس،۲۰۱۶ء)،ص ۳۰۴
5. ایضاً،ص ۳۰۵
6. تارڑ، مستنصر حسین، قلعہ جنگی،(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص ۱۱۹، ۱۲۰
7. خرم شہزاد، اردو میں ژاک دریدا کی سوانح: چند تسامحات پر ایک نظر، مشمولہ: تحقیق نامہ، شمارہ نمبر ۲۶، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء، ص ۱۶۴، ۱۶۵
8. مابعد جدیدیت:فلسفہ تاریخ کے تناظر میں، ص ۱۸۱، ۱۸۲
9. قلعہ جنگی، ص ۱۲۴
10. ایضاً، ص ۱۲۳، ۱۲۲
11. ایضاً، ص ۱۸۵
12. ایضاً، ص ۱۹
13. ایضاً، ص ۱۷۹
14. ایضاً، ص ۱۴۶
15. ایضاً، ص ۴۶
16. ایضاً، ص ۲۴، ۲۳
17. ایضاً، ص ۷، ۶
18. ایضاً، ص ۲۷
19. ایضاً، ص ۹۲ تا ۹۵
20. ایضاً، ص ۱۵۹
21. ایضاً، ص ۱۳۰، ۴۳
22. ایضاً، ص ۱۳۷

23. ایضاً، ص ۹۰، ۸۹، ۶۵، ۶۴

24. ایضاً، ص ۱۲۲، ۱۲۱، ۹۷

25. ایضاً، ص ۱۳۷

26. ایضاً، ص ۱۳۷

27. ایضاً، ص ۱۸۱، ۱۸۰

28. مابعد جدیدیت: فلسفہ تاریخ کے تناظر میں، ص ۲۰۲

29. زاہدہ حنا، تارڑ کا ناول قلعہ جنگی، مزید تفصیلات کے لیے
https://www.express.pk/story;/233985

ماخذ

اشتیاق احمد، ڈاکٹر، پاکستان عسکری ریاست، مترجم: ایم وسیم، لاہور: مشعل بکس، ۲۰۱۶ء

اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت (اصطلاحات اور معانی و تعبیرات و تشریحات)، اسلام آباد: نیشنل بک فائونڈیشن، ۲۰۱۶ء

اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت: فلسفہ تاریخ کے تناظر میں، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۳ء

تارڑ، مستنصر حسین، قلعہ جنگی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

Lyotard, Jean-Francois, ***The Modern Condition***, America, United Kindom: Manchester University Press, 1979

رسالہ

تحقیق نامہ، شمارہ نمبر ۲۶، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء

ویب گاہ

https://www.express.pk/story;/233985